پروفیسر محمد شریف چوہدری ☆

پاکستان کے سیاسی بحرانوں میں نظریہ ضرورت کا استعمال

طب کی اصطلاح میں ''بحران'' مرض کی شدت اور بیماری کے زور کو کہتے ہیں۔(۱) گویا نازک حالت، تعطل اور "Crisis" کو بحران کہتے ہیں۔ بحران مختلف النوع ہوتے ہیں، جیسے انتظامی، عدالتی، معاشی اور سیاسی بحران وغیرہ۔ اگر ملک میں سیاسی عدم استحکام ہو، ادارے آئین کے مطابق کام نہ کر رہے ہوں، ملک میں ابتری، انتشار، بے چینی اور بے یقینی کی کیفیت ہو، معاشرے میں امن وامان کے مسائل پیدا ہو جائیں اور ملکی سالمیت خطرے میں پڑ جائے تو ایسے بحران کو سیاسی بحران کہا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں کسی ایسی مقتدر قوت کی ضرورت ہوتی ہے جو پھر سے ملک کو آئین کے مطابق چلا سکے۔

آزادی کے بعد اس ملک میں متعدد سیاسی بحران آئے اور کسی نہ کسی طریقے سے ان تمام بحرانوں کو آئینی خلاؤں سے پر کرنے کی کوشش کی گئی۔

۱۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلا سیاسی بحران اس وقت پیدا ہوا جب گورنر جنرل غلام محمد نے ۲۴/اکتوبر ۱۹۵۴ء کو آئین ساز اسمبلی کو معطل کر دیا۔ آئین ساز اسمبلی نے ۲۰ ستمبر ۱۹۵۴ء کو پروڈا ☆☆ (PRODA) کو منسوخ کر دیا تھا۔ منسوخ شدہ ایکٹ کے تحت حکومت کو بدعنوان وزرا اور سیاست دانوں کے خلاف کارروائی کا حق حاصل تھا۔ اس کے ایک روز بعد اسمبلی نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کی دفعات ۹، ۱۰، ۱۰۔اے، اور ۱۰۔بی کو منسوخ کر دیا۔ ان دفعات کے تحت گورنر جنرل کابینہ توڑ سکتا تھا۔ اسمبلی کے ان اقدامات کا مقصد گورنر جنرل کے اختیارات کو محدود کرنا تھا تا کہ وہ ماضی کی طرح کابینہ نہ توڑ سکے اور خواجہ ناظم الدین والی داستان نہ دہرائی جائے۔ یہ سب کچھ گورنر جنرل کے علم میں لائے بغیر ایسے وقت میں کیا گیا جب وہ دارالحکومت سے باہر تھے۔ مذکورہ آئینی ترمیم کو اسمبلی میں منظور کروانے کے لیے غیر معمولی عجلت سے کام لیا گیا اور ایک دن کے اندر اندر منظور ہونے والی یہ ترمیم اسی روز گزٹ میں بھی شائع کر دی گئی۔ یہ اقدام انتقامی کارروائی کے مترادف تھا۔ گورنر جنرل فوری طور پر کراچی واپس پہنچے اور انہوں نے بیزار و بدگمان رائے عامہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسمبلی کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۲۴/اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ایک حکم نامے کے ذریعے ملک بھر میں ایمرجنسی نافذ

☆ سابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ کالج، گوجرانوالہ

☆☆PRODA: Public and Representatative Offices Disqualification Act, 1949

کر کے اسمبلی توڑنے کا اعلان کر دیا گیا۔(۲)

ڈیڑھ برس کے مختصر عرصے میں غلام محمد کی طرف سے کیا جانے والا یہ دوسرا اقدام تھا۔(اس سے پیشتر وہ خواجہ ناظم الدین کی کابینہ توڑ چکے تھے)۔ غلام محمد کے ان دونوں اقدامات نے ملک میں جمہوری اداروں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ (۳)

تحلیل کی جانے والی دستور ساز اسمبلی کے صدر مولوی تمیز الدین نے گورنر جنرل کے اس اقدام کو سندھ ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ انہوں اپنی درخواست میں موقف اختیار کیا کہ آزادی ہند ایکٹ مجریہ ۱۹۴۷ کی دفعہ ۶ کی ذیلی دفعہ ۳ کی رو سے قانون سازی کے لیے گورنر جنرل کی منظوری کی ضرورت نہیں۔ مولوی تمیز الدین نے برطانیہ کے ایک وکیل مسٹر ڈی این پرٹ☆ کو بھی اپنی معاونت کے لیے بلایا۔ چیف کورٹ آف سندھ کے فل بنچ نے مقدمے کی سماعت کی اور متفقہ طور پر گورنر جنرل کے اقدام کو غیر قانونی قرار دیا۔ فل بنچ نے لکھا:

''آئین ساز اسمبلی ایک خود مختار ادارہ ہے۔ اور یہ کہ اسے اس وقت تک نہیں توڑا جا سکتا جب تک کہ وہ مقصد، جس کے لیے اسمبلی وجود میں آئی تھی، حاصل نہ کر لیا جائے۔''(۴)

چیف کورٹ آف سندھ کے فل بنچ کے فیصلے کے خلاف وفاقِ پاکستان نے فیڈرل کورٹ میں اپیل دائر کر دی جس نے طویل سماعت کے بعد گورنر جنرل کے اقدام کو درست قرار دیتے ہوئے اس کی حمایت میں فیصلہ دیا۔ چیف جسٹس نے قرار دیا:

''وہ واحد بنیاد جس پر غیر قانونی امور کو قانونی قرار دیا جا سکتا ہے، وہ ضرورتِ حالات ہے..... گورنر جنرل نے ایک فوری تباہی کو روکنے کے لیے، ریاست اور معاشرے کو سقوط سے بچانے کے لیے یہ عمل کیا۔'' (۵)

جسٹس منیر نے قرار دیا:

''یہ امر واضح ہے کہ آزادی ایکٹ ۱۹۴۷ اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے پاکستان کو جو عبوری آئین ملا، دستور ساز اسمبلی کو ایک قانون کے ذریعے اسے عبوری آئین میں تبدیل کرنے کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ لہٰذا یہ استدلال بے معنی ہے کہ دستور ساز اسمبلی کو غیر معینہ مدت تک فرائض انجام دینے کا اختیار مل گیا ہے۔ اس ادارے کو مستقل حیثیت حاصل نہیں اور وہ قابلِ تحلیل ہے۔ آزادی ایکٹ کے سیکشن ۸ کے سب سیکشن (i) کے تحت دستور ساز اسمبلی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایکٹ کی رو سے عائد ہونے والے فرائض انجام دے۔ اس ایکٹ میں اسمبلی کو دائمی حیثیت نہیں دی گئی۔ گورنر جنرل کو جب یہ باور ہو گیا کہ دستور ساز اسمبلی ملک کو آئین دینے میں ناکام ہو گئی ہے تو اسمبلی توڑنے کا اختیار، جو اس سے پہلے التوا میں رکھا گیا تھا، دوبارہ مؤثر ہو گیا۔ آزادی ایکٹ کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ دستور ساز اسمبلی، آئین کی تیاری کی آڑ میں ریاست کی مقنّنہ کے طور پر غیر معینہ عرصے کے لیے فرائض انجام دیتی رہے، یہاں تک کہ اسے انقلاب کے ذریعے ہٹانا ضروری ہو جائے۔''(۶)

۲۔ پاکستان کے وزیر اعظم چودھری محمد علی ملک کے لیے ایسا دستور تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ۲۳ مارچ ۱۹۵۶

کونافذ ہوگیا، مگر اس وقت کے سیاستدانوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے ملک میں ایسے حالات پیدا کر دیے جن کی وجہ سے اس وقت کے آرمی چیف محمد ایوب خان نے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا۔

ملک میں عوامی لیگ اور ری پبلکن کی مخلوط حکومت قائم ہوئی، مگر یہ حکومت ایک سال سے زیادہ عرصہ برسر اقتدار نہ رہ سکی۔ اس کے بعد ملکی سیاست میں جوڑ توڑ اور عدم استحکام کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ فلور کراسنگ☆ کا معاملہ اتنا عام تھا کہ ہرنئی وزارت کچھ عرصے بعد ہی عدم استحکام کا شکار ہو کر دم توڑ جاتی۔ ایک طرف خان عبدالقیوم خان (مسلم لیگ کے نو منتخب صدر) نے زور وشور سے صدر سکندر مرزا کی مخالفت شروع کر دی اور دوسری طرف ون یونٹ کے خلاف اور علاقائی خود مختاری کی حمایت میں احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ زور پکڑ گیا۔ سیاست کی اس غیر یقینی کیفیت نے ترقیاتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ امنِ عامہ کی صورتِ حال کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ ملک کی اس بحرانی کیفیت میں ۸/ اکتوبر ۱۹۵۸ کو سکندر مرزا کی صدارت میں مارشل لا کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا اور ایوب خان چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ اس اعلان سے وزارتیں اور اسمبلیاں ختم ہوگئیں۔ جنرل محمد ایوب خان نے ۱۰/ اکتوبر ۱۹۵۸ کو کہا:

''انجام کار یہ ذمہ داری ہمیشہ فوج پر ہی عائد ہوتی ہے کہ وہ عوام کے حقوق کی حفاظت کرے۔'' (۷)

۲۷/ اکتوبر ۱۹۵۸ کو جنرل محمد ایوب خان نے ملک کی زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لی اور سکندر مرزا کو ہٹا کر خود صدر بن گئے۔ ۳۰/ اکتوبر کو جنرل ایوب خان نے بیان دیا:

''لوگ اس بات پر مضطرب تھے کہ اگر تمام اختیارات دو افراد کے پاس رہے تو پالیسی میں ابہام کا امکان پیدا ہوتا رہے گا۔'' (۸)

ایوب خان کے اس مارشل لا کو دوسو (Dosso) کیس میں چیلنج کر دیا گیا۔ مقدمے کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ جب ملک میں کوئی بدامنی نہیں تھی تو مارشل لا کا کوئی جواز نہ تھا، لیکن مسٹر محمد منیر چیف جسٹس آف سپریم کورٹ نے جنرل ایوب خان کے اس اقدام کو قانونِ ضرورت (Law of Necessity) کے تحت قانونی حیثیت دے دی۔ انہوں نے اپنے فیصلے میں لکھا:

''ایک جیتا ہوا انقلاب یا کامیاب تختہ الٹنا بین الاقوامی طور پر آئین تبدیل کرنے کا تسلیم شدہ قانونی طریقہ ہے۔ قانون کی اس شاخ کی تعریف سول یا ریاستی ضرورت ہے۔..... ایک کامیاب فوجی انقلاب از خود ایک نیا نظام قانون ہوتا ہے۔ جج اور عدالتیں اس نئے قانون کی پابند ہوتی ہیں، لہٰذا اس کے خلاف عدالت کسی رٹ کی سماعت نہیں کر سکتی۔'' (۹)

۳۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ کو صدر ایوب خان نے صدارت سے استعفا دے کر ملک کا نظام چلانے کے لیے اقتدار جنرل یحییٰ خان کو سونپ دیا جنہوں نے آتے ہی ملک میں ایک بار پھر مارشل لا نافذ کر دیا اور مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں اور وزارتیں توڑ دیں۔ آرمی چیف جنرل عبدالحمید خان، وائس ایڈمرل ایس ایم احسن اور ایئر مارشل نور خان نے اپنے عہدوں کے علاوہ نائب ناظمین اعلیٰ مارشل لا کے عہدے سنبھال لیے۔ مغربی پاکستان میں جنرل عتیق الرحمٰن اور مشرقی پاکستان میں جنرل مظفر الدین کو گورنر مقرر کر دیا گیا۔ (۱۰)

۲۶ مارچ کو چیف مارشل لا ایڈمسٹریٹر جنرل یحییٰ خان نے کہا کہ آئینی حکومت کی بحالی کے لیے وہ سازگار ماحول مہیا کریں گے۔ مغربی پاکستان کو ۷ زونوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پورے ملک میں صدر ایوب خان کی حکومت کے خاتمہ کے بعد امن وامان کی صورتِ حال بہتر ہوگئی۔ (۱۱)

۳۱ مارچ کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان نے ۲۵ مارچ سے صدر مملکت کا عہدہ سنبھال لیا۔ (۱۲)

مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے حکم کے تحت ملک غلام جیلانی، ممبر قومی اسمبلی اور مسٹر الطاف گوہر، ایڈیٹر انچیف روزنامہ ''ڈان'' کراچی کو ۲۲ دسمبر ۱۹۷۱ کو گرفتار کر لیا گیا اور ۵ فروری ۱۹۷۲ کو انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ اس پر مس عاصمہ جیلانی دختر ملک غلام جیلانی اور زرینہ گوہر زوجہ الطاف گوہر نے ان کی نظر بندی کو لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ عدالت نے ان کی درخواست کو مسترد کر دیا۔ مذکورہ خواتین اپنا مقدمہ سپریم کورٹ میں لے گئیں اور ایک ہی طرح کی دو رٹ پیٹشنز میں عاصمہ جیلانی بنام حکومت پنجاب و دیگر میں سپریم کورٹ نے جنرل یحییٰ خان کے مارشل لا کو ناجائز قرار دے دیا۔ چیف جسٹس حمود الرحمٰن نے دوسو کیس میں پیش کردہ کیلسن کے نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا:

''میں فاضل چیف جسٹس (محمد منیر) کا مکمل احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے کیس کے نظریہ کی تاویل میں اور اپنے سامنے پیش آمدہ حالات وواقعات پر اس کے انطباق میں غلطی کی۔ انہوں نے جس اصول کو پیش کیا، اسے بالکل حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا..... مارشل لا کے نفاذ کا تقاضا یہ نہیں کہ غیر فوجی عدالتیں بند ہو جائیں اور غیر فوجی (سیاسی) حکومت کا اختیار ختم ہو جائے..... یہ کہنا درست نہیں کہ مارشل لا کے اعلان کے ساتھ ہی از خود لازماً مسلح افواج کے کمانڈر کو یہ اختیار مل جاتا ہے کہ وہ اس دستور کو منسوخ کر دے جس کا تحفظ اس کا فرض تھا۔'' (۱۳)

۴۔ ۱۹۷۳ کا آئین پاکستان کے تمام صوبوں کا متفقہ آئین تھا اور اسے قومی اسمبلی میں موجود ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے تسلیم کیا تھا۔ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو ملک کے وزیر اعظم تھے۔ بعد میں ان کی حکومت کی کارکردگی اور بعض پالیسیاں بڑی حد تک آئین سے متصادم رہیں جس کی وجہ سے ملک کی سیاسی وجمہوری فضا مکدر ہوگئی۔ ۱۹۷۳ کے آئین کے تحت پہلے عام انتخابات مارچ ۱۹۷۷ میں منعقد ہوئے۔ حکمران جماعت (پاکستان پیپلز پارٹی) پر انتخابات کے نتائج کا اعلان کرنے میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کا الزام لگایا گیا جس کے نتیجے میں ملک بھر میں زبردست احتجاجی تحریک چلی جس کی وجہ سے ملکی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ کئی ماہ پر محیط عوامی احتجاج اور حکمرانوں کے سخت رویے نے ملک کو ایک سنگین سیاسی بحران سے دوچار کر دیا تو اس وقت کے بری فوج کے سربراہ جنرل محمد ضیاء الحق نے ۱۹۷۳ کے آئین کو معطل کر کے ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو اقتدار پر قبضہ کر لیا اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ (۱۴)

آئین کی رو سے فوجی حکمران پر آئین توڑنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جا سکتا تھا، اس لیے فوجی حکمران نے انقلاب کے آغاز میں یقین دلایا کہ آئین کو منسوخ نہیں بلکہ اسے وقتی طور پر معطل کیا گیا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کی طرف سے یہ اعلان بھی کیا گیا کہ اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے اس میں ضروری ترمیم کی جائے گی۔ (۱۵)

بیگم نصرت بھٹو نے آئین کی خلاف ورزی پر فوجی حکمران کے خلاف سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔

سپریم کورٹ نے ۱۰ نومبر ۱۹۷۷ء کو اپنے فیصلے میں بیگم نصرت بھٹو کی طرف سے دائر کردہ حبس بے جا کی درخواست متفقہ طور پر مسترد کر دی۔ اس طرح ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو نافذ ہونے والے مارشل لا کو آئینی ضرورت قرار دیتے ہوئے ایک ''مؤثر العمل'' حکومت قرار دیا۔ اس وقت کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس محمد انوار الحق نے اپنے فیصلے کے آخر میں لکھا:

''عدالت واشگاف الفاظ میں بیان کرتی ہے کہ وہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے اقدام کو جائز قرار دیتی ہے۔
اور یہ صرف اس وجہ سے نہیں کہ اس نے گھمبیر ماورائے آئین قسم کے قومی اور آئینی بحران کے موقع پر ملک کو بچایا
بلکہ اس کی طرف سے ایک سنجیدہ وعدہ بھی کیا گیا کہ آئینی تعطل کو جتنا جلد ممکن ہو سکا ختم کر دیا جائے گا۔'' (۱۶)

۵۔ ۱۹۸۸ء میں جنرل محمد ضیاء الحق نے اپنے نامزد وزیر اعظم محمد خان جونیجو کو برطرف کر دیا اور قومی اسمبلی توڑ دی۔

۲۹ مئی ۱۹۸۸ کو جنرل محمد ضیاء الحق نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کر کے قوم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ جونیجو حکومت کو ختم کیا جا رہا ہے اور قومی اسمبلی کو آئین کی دفعہ ۵۸۔۲ (بی) کے تحت تحلیل کیا جا رہا ہے۔ صدر کا موقف یہ تھا کہ قومی اسمبلی اپنی تفویض کردہ ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہی ہے۔ نفاذ اسلام کی کوششوں میں پیش رفت نہیں ہو سکی اور پاکستان کے عوام کے جان و مال کا تحفظ بھی نہیں کیا جا سکا۔ (۱۷)

جنرل محمد ضیاء الحق نے ۳۰ مئی ۱۹۸۸ کو ٹیلی وژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وزیر اعظم مکمل طور پر سیاسی دباؤ کا شکار ہو چکے تھے جس سے کرپشن، اقربا پروری اور بدنظمی عام ہوئی اور ملک میں امن و امان کی صورت حال بگڑ گئی۔ (۱۸)

جب تک صدر ضیاء الحق بقید حیات رہے، کسی نے بھی حکومت کو برطرف کرنے اور اسمبلیاں تحلیل کرنے کے اقدام کو عدالت میں چیلنج نہ کیا۔

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو صدر ضیاء الحق ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہو گئے تو یہ معاملہ عدالتوں میں اُٹھایا گیا۔ چنانچہ حاجی سیف اللہ کیس میں عدالت عالیہ لاہور نے ۲۷ ستمبر ۱۹۸۸ کو اپنے فیصلے میں لکھا کہ قومی اسمبلی اور پنجاب اسمبلی کی تحلیل کی جو وجوہات بیان کی گئی تھیں، وہ اتنی غیر واضح، سطحی اور ناپید تھیں کہ قانون کی نظر میں ان احکامات کی کوئی حیثیت نہیں بنتی۔ (۱۹)

لاہور ہائی کورٹ نے اسمبلیاں تحلیل کرنے کے حکم کو غیر قانونی قرار دیا۔ تاہم حالات و واقعات کے تناظر میں تحلیل شدہ اسمبلیوں کو بحال نہ کیا اور یہ فیصلہ دیا کہ اب جمہوری عمل کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ لہٰذا قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات پروگرام کے مطابق ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کو ہوں گے اور منتخب نمائندوں کو آئین کے مطابق اقتدار منتقل ہو گا۔ (۲۰)

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو ملک کی عدالت عظمیٰ نے حکومت اور حاجی سیف اللہ کی طرف سے دائر کردہ ایک ہی طرح کی متعدد اپیلوں کا فیصلہ سناتے ہوئے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلہ کو بحال رکھا اور قرار دیا کہ آئین اور قانون کے مطابق قومی امور کا فیصلہ کرتے وقت عدالتیں ہمیشہ ملک کے مفاد کو مقدم رکھتی ہیں، کیونکہ نجی مفادات اور انفرادی حقوق پر قومی مفادات کو ترجیح دینا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اب جبکہ انتخابات قریب ہیں تو عوام کو آئین میں دیے گئے حقوق کے مطابق جماعتی

بنیادوں پر قومی اسمبلی کے لیے اپنے نمائندگان منتخب کرنے کی اجازت دینا بہت ضروری ہے۔(۲۱)

۶۔نومبر ۱۹۸۸ میں ملک میں جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات ہوئے۔محترمہ بے نظیر بھٹو کی سیاسی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لی۔اس طرح اکثریتی سیاسی جماعت کی سربراہ ہونے کی حیثیت سے انھوں نے ۲دسمبر ۱۹۸۸ءکو بحیثیت وزیر اعظم پاکستان حلف اٹھایا۔بے نظیر بھٹو کو مرکز میں ایک مضبوط حزبِ مخالف کا سامنا تھا۔ملک کے بڑے صوبے پنجاب میں بھی حزب مخالف کی حکومت تھی۔وفاق اور صوبہ پنجاب کی حکومت کے مابین جلد ہی اختلافات پیدا ہونا شروع ہوگئے۔حزب مخالف نے حکومت کی اس شدت سے مخالفت کی کہ قومی اسمبلی میں وزیر اعظم کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کر دی گئی۔وزیر اعظم نے اپنی حکومت کو بچانے کے لیے اسمبلی کے ارکان کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے بدعنوانی کا سلسلہ شروع کر دیا۔حزب مخالف نے بھی ایسے ہی کیا۔اسے ''ہارس ٹریڈنگ'' کا نام دیا گیا۔عوام الناس نے اس کام کی مذمت کی اور بیرون ملک یہ عمل تضحیک کا باعث بنا۔اس طرح دنیا بھر میں ملکی وقار کو سخت دھچکا لگا۔(۲۲)

حکومت کی برطرفی اور اسمبلیوں کی تحلیل کے خلاف خواجہ احمد طارق رحیم نے سپریم کورٹ میں رٹ دائر کر دی۔بحث کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ جن الزامات کے تحت اسمبلی توڑی گئی ہے،ان کا آئین کی دفعہ ۵۸۔۲(بی) کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔چنانچہ مقدمہ کی سماعت کے بعد ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۰ءکو سپریم کورٹ نے حکومت بحال کرنے کی یہ درخواست مسترد کر دی اور یہ فیصلہ دیا کہ حکومت کی برطرفی دفعہ ۵۸۔۲(بی) کے مطابق ہوئی ہے۔

عدالت نے اپنے فیصلہ میں حکومتی برطرفی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ حکومت آئین کے مطابق کام نہیں کر رہی تھی،وفاقی حکومت نے صوبہ سندھ کے اندرونی معاملات میں غیر آئینی مداخلت کی،سینٹ اور اعلیٰ عدالتوں جیسے باوقار اور اہم اداروں کا عوام میں تمسخر اڑایا گیا،سیکرٹ سروس فنڈز کے کروڑوں روپے قومی اسمبلی کے ارکان پر خرچ کر دیے گئے اور تحریک عدم اعتماد کے موقع پر PAF اور PIA کے جہازوں کا غیر قانونی استعمال کیا گیا اور سول سروس میں میرٹ کے بغیر بھرتیاں کی گئیں اور قانون کی خلاف ورزی کی گئی۔عدالت نے تحریر کیا:

''محولہ بالا حقائق کی روشنی میں صدر پاکستان حق بجانب تھے کہ دستور کی دفعہ ۵۸۔۲(بی) کا براہ راست استعمال کرتے۔''(۲۳)

۷۔۱۹۹۳ میں قومی اسمبلی تحلیل کیے جانے کے ضمن میں جو واقعات رونما ہوئے،وہ ذیل میں بالاختصار بیان کئے جاتے ہیں۔وزیر اعظم دائیں بازو کے اتحاد کے سربراہ تھے جو ۱۹۹۲ء کے آخر تک کمزور ہو چکا تھا۔اتحاد کے کئی ارکان نے قومی اسمبلی کے سپیکر کے نام استعفے لکھ کر انہیں صدر پاکستان تک پہنچا دیا۔اخبارات میں ان استعفوں کی خوب تشہیر ہوئی۔اس سے وزیر اعظم شدید اعصابی تناؤ کا شکار ہوگئے۔ان حالات میں ۱۷/اپریل ۱۹۹۳ کو انہوں نے قوم سے خطاب کیا اور ملک کے سیاسی حالات میں بگاڑ کا ذمہ دار صدر کو ٹھہرایا اور اعلان کیا کہ وہ استعفا نہیں دیں گے،اسمبلیاں نہیں توڑیں گے،اور ڈکٹیشن نہیں لیں گے۔

اس تقریر پر صدر نے بڑے غصے کا اظہار کرتے ہوئے اگلے ہی روز یعنی ۱۸/اپریل کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے قومی اسمبلی تحلیل کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔صدر نے بلخ شیر مزاری کو نگران وزیر اعظم مقرر کر دیا۔

اس طرح پاکستان کے عوام نے محسوس کر لیا کہ صدر کو حاصل اختیارات کی موجودگی میں صدر اور پارلیمانی نظامِ جمہوریت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس سوچ کی وجہ سے لوگوں کی ہمدردیاں معزول وزیر اعظم کے ساتھ ہو گئیں

معزول وزیر اعظم نے آئین کے آرٹیکل ۱۸۴(۳) کے تحت صدر کے اس اقدام کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا۔

صدرِ پاکستان نے نواز شریف حکومت پر جو بڑے بڑے الزامات عائد کئے تھے ان میں پیداواری وسائل پر چند من پسند افراد کی اجارہ داری، اندھا دھند اقربا پروری مشترکہ مفادات کی کونسل کا عضو معطل بن کر رہ جانا، قومی مالیاتی کمیشن کی ناقص کارکردگی اور ناکام خارجہ پالیسی شامل تھے۔ (۲۴) تاہم عدالت نے قرار دیا کہ صدر پاکستان نے ۲۲ دسمبر ۱۹۹۲ء کے اپنے خطاب میں حکومتی معاملات کی تعریف کی جبکہ ۱۸/اپریل ۱۹۹۳ء کو حکومتی معاملات کی تنقیص کی۔ اس طرح صدر کے خطابات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ (۲۵) یوں عدالت نے نواز شریف حکومت کو بحال کر دیا۔

۸۔ ۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو صدر مملکت فاروق احمد لغاری نے دستور کی دفعہ ۵۸۔۲ (بی) کا استعمال کرتے ہوئے بے نظیر بھٹو حکومت کو ختم کر دیا۔ قومی اسمبلی توڑ دی اور ملک معراج خالد کی سربراہی میں نگران حکومت قائم کر دی۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت دوسری مرتبہ تحلیل کیے جانے کی وجوہات میں سے عدلیہ کے ساتھ چپقلش اور خصوصاً چیف جسٹس آف پاکستان کی ناراضی، صدر مملکت کے ساتھ بے نظیر بھٹو اور اس کے خاوند آصف زرداری کا اہانت آمیز سلوک، حکمران جوڑے کے خلاف بدعنوانی کے الزامات اور بدعنوان عناصر کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی زیادہ اہم تھیں۔

علاوہ ازیں ملک بھر میں لاقانونیت کا اس قدر دور دورہ ہو گیا کہ وزیر اعظم کے حقیقی بھائی پر مرتضیٰ بھٹو کو پولیس نے ان کے آٹھ ساتھیوں سمیت اس وقت گولیاں مار کر ہلاک کر دیا جب وہ اپنے گھر سے چند میٹر کے فاصلے پر تھے۔ وزیر اعظم کی طرف سے اس خون ریزی کی پشت پناہی کا الزام صدر اور دیگر اہم اداروں پر لگایا گیا۔

اس کے علاوہ آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انتظامیہ اور عدلیہ کے بعض افسران کو ان کے عہدوں سے مقررہ مدت کے اندر تبدیل نہ کیا گیا، عدلیہ کے بعض ججوں، اعلیٰ فوجی اور سول افسران کی ٹیلی فون کالز غیر آئینی طور پر ٹیپ کی گئیں، رشوت ستانی اس حد تک بڑھ گئی کہ ملکی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ (۲۶)

۵ نومبر ۱۹۹۶ء کے صدر پاکستان کے اقدام کو برطرف وزیر اعظم نے سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ سات ججوں پر مشتمل عدالت کے فل بنچ نے صدر فاروق احمد لغاری کی طرف سے سابقہ وزیر اعظم پر لگائے گئے الزامات کا جائزہ لیا۔ صدر نے اپنے الزامات کے حق میں ٹھوس شواہد پیش کیے۔ عدالت نے بے نظیر بھٹو کے وکیل مسٹر اعتزاز احسن کے اس موقف کو قبول نہیں کیا کہ قومی اسمبلی توڑنے کے لئے آرٹیکل ۵۸۔۲ (بی) صرف اسی ضرورت میں استعمال ہو سکتا ہے جب حالات اس قدر خراب ہو جائیں کہ ملک میں مارشل لاء لگنے کا امکان پیدا ہو جائے۔ مختلف جج صاحبان کے تقرر کے سلسلے میں آئین کے آرٹیکل ۱۹۰ اور ۲۔اے سے صرف نظر کرنے کے بارے میں خاصا مواد پیش کیا گیا۔ پھر جج صاحبان کے بارے میں بھی صدر نے وزیر اعظم کی قومی اسمبلی میں کی جانے والی تقریر میں تضحیک آمیز رویے کے بارے میں خاصا مواد مہیا کیا، تاکہ جج صاحبان کے لیے خوف و ہراس پیدا کیا جائے۔ پھر پارلیمنٹ میں پندرہویں ترمیم کا بل پیش کیا، تاکہ جج صاحبان سے جوابدہی کی جا سکے اور انہیں جبری رخصت پر فارغ کیا جا سکے، بشرطیکہ بل پندرہ فیصد ارکان کی طرف سے پیش کیا

جائے۔عدلیہ کو انتظامیہ سے مکمل طور علیحدہ کرنے کے اقدام کو بھی جان بوجھ کر مؤخر کیا گیا اور انتظامیہ کے مجسٹریٹوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ ملزموں کو تین سال تک قید کی سزا دے سکیں گے جو انصاف کے منافی تھا۔

عدالت نے کہا کہ اس بات کا کافی ثبوت عدالت موجود ہے جو یہ ثابت کر سکے کہ وزیر اعظم نے سپریم کورٹ کے جج صاحبان، سیاسی جماعتوں کے راہنماؤں، ملٹری اور سول سروس کے اعلیٰ عہدیداروں کی ٹیلی فون کالز ریکارڈ کیں اور اس مواد کا مسودہ برائے مطالعہ مدعیہ کو بھی مہیا کیا گیا۔

مدعیہ کے خلاف بدعنوانی، اقربا پروری اور قوانین کی خلاف ورزیوں پر مشتمل کافی مواد مہیا کیا گیا۔۲۹ جنوری ۱۹۹۷ کو عدالت نے قرار دیا کہ درج بالا وجوہات کی بنا پر ۵ نومبر کے صدر کے قومی اسمبلی کے تحلیل کرنے کے اقدام کو جائز قرار دیا جاتا ہے اور اس اقدام کے خلاف مدعیہ کی درخواست کو مسترد کیا جاتا ہے۔(۲۷)

۹۔۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ نے قومی اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل کر لی جس کے نتیجے میں مسلم لیگ کے سربراہ میاں نواز شریف ملک کے وزیر اعظم بن گئے۔میاں نواز شریف نے حصول اقتدار کے ساتھ ہی جمہوریت کے خول میں مطلق العنان حکمرانی کے لیے اقدامات شروع کر دیے اور کئی ایسے اقدامات کیے جن سے قومی معیشت تباہی کی طرف رواں دواں ہوگئی۔ملک میں کرپشن عام ہوگئی اور حکمران جماعت کے ارکان کی اکثریت اس برائی میں پیش پیش تھی۔تھوڑے ہی عرصے میں عوام خود کو بے اطمینانی اور انتشار کے ماحول میں محسوس کرنے لگے۔

میاں نواز شریف نے اپنی ذات میں اختیارات کے ارتکاز کے عمل کو جاری رکھا اور اسی تسلسل میں انہوں نے آرمی چیف جنرل پرویز مشرف کو برطرف کر دیا (جو اس وقت سری لنکا کے دورے پر تھے) اور سینیارٹی کے اصول کو ملحوظ رکھے بغیر جنرل ضیاء الدین کو آرمی چیف مقرر کر دیا۔بری فوج کے سینئر جنرلز نے وزیر اعظم کے اس اقدام کو سخت ناپسند کیا اور نئے آرمی چیف کے تقرر کو مسترد کر دیا۔اسی اثنا میں ہنگامی طور پر جنرل مشرف سری لنکا کے دورے سے واپس آ گئے اور انہوں نے ردِعمل کے طور پر ۱۲/ اکتوبر ۱۹۹۹ کو دیگر آرمی آفیسرز کے تعاون سے نواز شریف حکومت کو ختم کر دیا۔وزیر اعظم، ان کے مقرر کردہ آرمی چیف جنرل ضیاء الدین، وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف اور ان کے کئی دیگر معتمد ساتھیوں کو اپنی حراست میں لے لیا گیا۔۱۴/ اکتوبر کو فوج کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا:

> ''نواز شریف طویل عرصے سے فوج کے خلاف منظم سازشوں میں مصروف تھے۔جنرل مشرف کو وطن واپسی پر گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور سازش کے تحت جنرل ضیاء الدین کو آرمی چیف قرار دیا گیا۔''(۲۸)

وزیر اعظم نواز شریف کی حکومت کے خاتمے پر ان کے نمائندے ظفر علی شاہ نے مسلح افواج کے اقدام کے خلاف سپریم کورٹ میں رٹ دائر کر دی۔اس وقت ملک میں ہنگامی حالت نافذ تھی۔اعلیٰ عدالتوں اور عدالتِ عظمیٰ کے منصفین (Judges) کے لیے لازمی قرار دیا گیا کہ وہ ۱۹۹۹ کے نئے PCO No.1☆ کے تحت نئے سرے سے حلف اٹھائیں کیونکہ ۱۹۷۳ کے آئین کے بعض حصے معطل کر دیے گئے تھے جس کے تحت وہ اس سے قبل کام کر رہے تھے۔ملک میں ہنگامی حالت کے نفاذ کی افادیت کی وضاحت یوں کی گئی کہ ملک میں بدامنی تھی اور عوام میں بہت زیادہ بے چینی پائی جاتی تھی اور مسلح افواج کے سربراہ کے بقول ملکی حالات سدھارنے کے لیے ۱۹۷۳ کا آئین ناکام ہو چکا تھا۔اس لیے درج

بالا نئے ضابطے کی ضرورت پیش آئی۔ اس ضابطے میں بعض انسانی حقوق سلب کر لیے گئے جو ۱۹۷۳ کے آئین میں عوام کو حاصل تھے۔ سابق وزیراعظم کی طرف سے سپریم کورٹ میں جو رٹ دائر کی گئی وہ منظور تو کر لی گئی مگر منصفین حضرات PCO No.1,1999 کے تحت آزادانہ فیصلے کرنے سے عاجز تھے۔

PCONo.1,1999 کے نفاذ کے بعد عدلیہ کے سامنے تین راستے تھے:

۱۔ تمام منصفین حضرات اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں اور ہر پاکستانی شہری کو جو انصاف کسی بھی ذریعے سے ملتا ہے، اس کا راستہ بند کر دیا جائے۔

۲۔ نئی حکومت کے احکامات کو مانتے ہوئے، وزیراعظم کے عہدے کی بحالی کے لیے دائر کردہ رٹ یا اسی طرح کی کسی دوسری رٹ کو مسترد کر دیا جائے۔

۳۔ معروضی حالات میں رٹ منظور کر لی جائے اور باقی ماندہ عدالتی اداراتی اقدام کو بچا لیا جائے۔ (۲۹)

ان پیش آمدہ حالات میں ملکی مفادات اور عوام کے باقی ماندہ حقوق کو محفوظ کرنے کے لیے اکثر منصفین حضرات نے طے کیا کہ PCO NO.1ء1999 کے حکم کے تحت نئے سرے سے حلف اٹھایا جائے تاکہ مستقبل میں جہاں تک ممکن ہو سکے جمہوری اداروں کی بحالی کے لئے کوشش جاری رکھی جائے۔ اس سطرح نئے حلف کے تحت منصفین حضرات فوجی حکمران کے احکامات ماننے پر مجبور تھے۔ اس طرح نظریہ ضروریات کے تحت عدالت عظمیٰ کے منصفین حضرات نے یہ قرار دیا کہ ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جو صورت حال پیش آئی، ۱۹۷۳ کا آئین اس کا کوئی حل پیش نہیں کر سکا تھا، اس لیے مسلح افواج نے ماورائے آئین ملکی سیاسی امور میں جو مداخلت کی، وہ ناگزیر تھی۔ عدالت نے کہا کہ ۱۹۷۳ کا آئین بڑے قانون کی صورت میں اب بھی موجود ہے تاہم اس کے بعض اجزا ملکی ضرورت کے لیے منسوخ ہیں اور یہ کہ ملک کی اعلیٰ عدالتیں آئین کے تحت کام کرتی رہیں گی۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ سپریم کورٹ کے جج صاحبان نے ۲۰۰۰ کے حکم نمبر ۱ کے تحت حلف اٹھایا ہوا ہے جس کی وجہ سے جج صاحبان اس حکم سے انحراف کرتے ہوئے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اگرچہ عدالتیں بنیادی طور پر ۱۹۷۳ کے آئین کے تحت ہی قائم کی گئی تھیں، تاہم گاہے گاہے چیف ایگزیکٹو دیگر عدالتی و قانونی احکامات بھی صادر کرتے رہتے ہیں۔

عدالت نے قرار دیا کہ جنرل پرویز مشرف، جو کہ چیف آف آرمی سٹاف اور جائینٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین ہیں، آئینی عہدے کے حامل ہیں، ان کی واضح اور آمرانہ طور پر برطرفی جو سینیارٹی کے حوالے سے بے قاعدہ تھی، غیر قانونی ہو گئی ہے۔ عدالت نے مذکورہ معالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے چیف ایگزیکٹو کو فوج کی مداخلت کے دن یعنی ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ سے لے کر تین سال کا عرصہ دیا تاکہ وہ اپنے اعلان کردہ مقاصد حاصل کر لیں۔

عدالت نے کہا کہ چیف ایگزیکٹو کو ایک تاریخ مقرر کرنا ہو گی جو اوپر بیان کردہ تین سال کی مدت کے بعد ۹۰ دن سے زیادہ کی تاخیر سے نہ ہو، تاکہ اس تاریخ کو قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلیوں اور سینٹ کے عام انتخابات کرائے جائیں۔ (۳۰)

حوالہ جات

(۱) لوئیس معلوف، المنجد، ص ۲۵

(۲) PLD 1955, Vol VII, Page 142, 143 (Sind) وصفدر محمود، ''پاکستان۔تاریخ وسیاست''،ص 54،53

(۳) صفدر محمود، ''پاکستان۔تاریخ وسیاست''،ص54

(۴) PLD 1955 V. II, 106 Sind

(۵) Ibid

(۶) PLD 1955 FC 435 Vol. 1

(۷) سیدنور احمد''، مارشل لا سے مارشل لا تک''،ص۵۱۹

(۸) ایضاً،ص۵۲۲

(۹) PLD 1958 SC 533 Vol 1

(۱۰،۱۱،۱۲) رضی الدین رضی، ''پاکستان،۵۳سال''،ص۴۴۹،۴۵۰

(۱۳) PLD 1972, SC 130, 183, 187, 190

(۱۴) Dr. Tanzeel-ur-Rahman, "Islamization of Pakistan Law", P.4

(۱۵) اداریہ روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۷جولائی ۱۹۷۷

(۱۶) PLD 1977, vol. xxlx SC 725

(۱۷) The Daily Dawn, Karachi, 30 May 1988

(۱۸) Ibid, 31 May 1988

(۱۹) PLD 1988 Lahore 725

(۲۰) Ibid

(۲۱) PLD 1989 SC 166

(۲۲) عابد تہامی، ''انتخابات ۱۹۹۰ کا وائٹ پیپر''،ص۲۳

(۲۳) PLD 1990 Lahore 507

(۲۴) PLD 1993 SC 753

(۲۵) PLD 1993 SC 894

(۲۶) زاہد حسین انجم، ''الیکشن ۱۹۷۷''،ص۲۹ تا ۳۷

(۲۷) PLD 1998 SC 471

(۲۸) روزنامہ جنگ لاہور، ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۹، روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۹

(۲۹) PLD 2000 Part II SC 1215

(۳۰) PLD 2000 Part II SC 1213, 1214